© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بڑے چھوٹے تمام احراری ان کی زندگی میں بھی انہیں "شاہ جی" کہتے تھے، اب بھی شاہ جی کہتے ہیں۔ نہ کوئی شخص "شاہ صاحب" کہتا تھا اور نہ فرطِ احترام سے ان کا نام لیتا تھا۔ اب بھی یہی صورت حال ہے۔ جب کوئی احراری "شاہ جی" کہے تو سمجھ لیجئے کہ اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مُراد ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ میرے مسلک کی رو سے "تقلید" جائز نہیں، لیکن میں اس سلسلے میں "مقلد" ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مقلد کسی امام فقہ کا نہیں، احراریوں کا......! جن کے نقطۂ نظر سے مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر شاہ جی کا ذکر کرنے لگا ہوں تو مجبور ہوں کہ ان کی "تقلید کا قلادہ" اگر اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا تو قلم کی "گردن" میں ضرور ڈال دوں چنانچہ ان کی تقلید کرتے ہوئے، میں نے ہر جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ یا شاہ صاحب کی بجائے شاہ جی ہی لکھا ہے (اسحاق بھٹی)

فیروز پور شہر اور ضلعے میں مجلس احرار سے منسلک حضرات، تعداد میں اگرچہ کم تھے، لیکن اپنی اپنی جگہ خاص اثر و رسوخ کے مالک اور معاشرتی اعتبار سے باوقار مرتبے کے حامل تھے۔ شہر کی مجلس احرار میں مولانا عبیداللہ احرار، خان عبدالعظیم خان، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، حکیم احمد علی، میر محمد علی اور حاجی نظام الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مجلس احرار سے میرا کبھی سیاسی تعلق نہیں رہا، لیکن ان سب حضرات سے میرے مراسم تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ عبدالعظیم خاں خانیوال میں، حاجی نظام الدین گوجرانوالہ میں، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ لاہور میں، حکیم احمد علی کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں اور مولانا عبیداللہ احرار (جو بعد میں پاکستان کی مجلس احرار کے صدر منتخب کیے گئے) فیصل آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ اب یہ تمام بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور فقط ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں جو روح کو تڑپاتی اور دل کو غمگسار کرتی ہیں۔

جب تک یہ زندہ رہے، ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض کے جنازوں میں بھی بچشم اشک بار شرکت کی اور اس وقت ان کی یادوں نے قلب و ذہن کو شدید جھٹکے دیے۔ ان میں سے بعض کے لڑکوں سے اب تک سلسلۂ روابط قائم ہے اور جب کسی سے کہیں ملاقات کا موقع ملتا ہے تو عزت و احترام سے پیش آتے ہیں اور بات شروع ہو جائے تو حافظے کی تہوں میں دبے ہوئے بے شمار واقعات اچھل اچھل کر نظر و بصر کے زاویوں میں آجاتے ہیں اور پھر زبان ان کے اظہار و بیان کے لئے بے قرار ہو جاتی ہے۔ میرے وہ ہم نشین اور یاران محفل بے شک اس دنیا سے رختِ سفر باندھ گئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، مگر دل کی دنیا میں بدستور آباد ہیں۔ فیضی کا یہ شعر اس صورت حال کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

ای ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید، ولی نہ از دلِ ما

کتنی ہی ایسی ہستیاں اس جہان فانی سے یکے بعد دیگرے کوچ کر گئیں، جن سے شب و روز کا تعلق تھا اور ان کی زندگی میں کبھی جدائی کا احساس تک نہیں ہوا تھا، خیال یہی تھا کہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور ہنسی خوشی سے وقت گزرتا رہے گا۔ اب وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے ہیں تو آنکھیں کھلی ہیں اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ اس بھری پری اور ہنستی بستی دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔

ز رفتن تو، من از عمر بے نصیب شدم
[illegible] وطن غریب شدم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیروز پور کی مجلس احرار کے یہ چند افراد اس شہر کی جان تھے اور وہاں کی سیاسی اور سماجی رونقیں ان کے دم قدم سے پورے جوبن پر تھیں۔

شہر سے چودہ میل کے فاصلے پر بجانب مغرب ایک گاؤں، جو تحصیل فیروز پور میں واقع تھا، "لکھوکے" کے نام سے موسوم تھا۔ اس گاؤں میں کئی پشتوں سے علم کا دریا رواں تھا اور درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے۔ اس میں ایک بزرگ مولانا محمد علی لکھوی فروکش تھے، جو حضرت حافظ محمد لکھوی (صاحب تصانیف کثیرہ) کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی کے فرزند ارجمند تھے۔ یہ مجاہدانہ فطرت کے مالک اور انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ کئی مرتبہ خود بھی مرکز مجاہدین میں گئے، جہاد کے لئے بھی بہت سے لوگوں کو وہاں بھیجا، مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے رہے۔ موجودہ نسل کے لوگوں سے ان کا تعارف اس طرح کرایا جا سکتا ہے کہ یہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر مولانا معین الدین لکھوی اور مولانا محی الدین لکھوی کے والد گرامی قدر تھے۔

مولانا محمد علی لکھوی جلیل القدر عالم اور بڑی فعال و متحرک شخصیت تھے۔ انہوں نے انگریزی حکومت کی مخالفت کے لئے ایک باقاعدہ تربیت گاہ قائم کر رکھی تھی، جس میں دینی و دنیوی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جہاد کی مشق و تمرین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ تربیت گاہ "لکھوکے" سے ڈھائی میل کے فاصلے، پر ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ، دو مربع زمین میں قائم کی گئی تھی اور اس کا نام انہوں نے "مرکز الاسلام" رکھا تھا۔

مولانا محمد علی کا مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت تو نہ تھا، البتہ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے اکابر و اعیان سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ پھر ان کا بہت بڑا حلقہ ارادت اور دائرہ متاثرین بھی تھا۔ انہیں اس غلام ملک میں رہنا پسند نہ آیا تو ۱۹۳۰ء میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں مسجد نبویؐ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ چند سال بعد واپس وطن آئے تو ۱۹۳۸ء میں پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اوکاڑہ آئے جہاں قیام پاکستان کے زمانے میں ان کے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اس عالم اجل نے اکتوبر ۱۹۷۳ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

وہ سال نجانے مدت ہوئی ٹوٹ گئے، جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالم وجود میں آئے تھے۔

مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کے بعد مرکز الاسلام کی تربیت گاہ کے انتظام کی ذمے داریاں ان کے دونوں صاحب زادوں..... مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی ... نے سنبھال لی تھیں۔ اب وہاں مجاہدین کی تیاری کا سلسلہ تو ختم ہو گیا تھا، البتہ مدرسہ باقاعدہ قائم رہا، جس میں قدیم و جدید علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میں وہاں یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے آخر سال تک طالب علم کی حیثیت سے اور مارچ ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک معلم کی حیثیت سے مقیم رہا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا محمد علی لکھوی مرکز الاسلام میں تشریف فرما تھے۔ اس سال کی مئی کے پہلے ہفتے میں فیروز پور کی مجلس احرار کے تین رہنما... مولانا عبیداللہ احرار، خان عبدالعظیم خاں اور حکیم احمد علی..... مولانا محمد علی کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اب سے پانچ مہینے بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہم نے فیروز پور میں مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، آپ سے درخواست ہے کہ اس ضمن میں رہنمائی فرمائیں اور ضلع فیروز پور کے قصبات و دیہات میں جلسے کی تشہیر کا اہتمام کریں۔ مولانا نے ان کی بات سنی اور درخواست منظور فرمائی۔

ان کے بڑے صاحب زادے مولانا محی الدین لکھوی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں، انہیں جلسے کی تشہیر کے لئے دو تین پنجابی نظمیں لکھنے کا حکم دیا اور طلبا کی دو ٹولیاں بنا دی گئیں۔ ایک کا قائد محی الدین کو اور ایک کا معین الدین کو مقرر کیا گیا۔ سب کے لئے لال رنگ کی ایک ایک قمیص سلا دی گئی۔ مئی کا مہینہ، سخت گرمی کا موسم، ہم نے لال رنگ کی قمیصیں پہنیں اور احرار کے جلسے کی تشہیر کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں گاؤں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب کوئی احراری "شاہ جی" کہے تو سمجھ لیجئے کہ اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہیں

پیدل جاتے' اچھی سی آواز والا کوئی لڑکا نظم کا ایک شعر پڑھتا اور پھر سب لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اس شعر کو دہراتے۔ اس طرح ہم ہر گاؤں کی گلی گلی گھومتے' عورتیں گھر کے دروازے میں کھڑے ہو کر اور مرد باہر نکل کر ہمیں دیکھتے۔ بچے ہمارے ساتھ چل پڑتے' جس گاؤں میں دوپہر ہو جاتی' وہاں کی مسجد میں چلے جاتے' لوگ گھروں سے روٹیاں لا کر ہمیں کھلاتے اور لسی پانی پلاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد اگلے گاؤں کا قصد کر لیا جاتا۔ جس گاؤں میں رات پڑتی' وہاں کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ روٹی پانی کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے۔ عشاء کے بعد مسجد میں مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پہلے پنجابی نظم پڑھی جاتی اور پھر ہمارا قائد تقریر کرتا۔ صبح کو لسی پانی کے بعد پھر سلسلۂ سفر شروع ہو جاتا۔

نظموں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کے مظالم بیان کیے جاتے' انگریز دشمنی کی پاداش میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو جو تکلیفیں دی گئیں یا دی جا رہی تھیں' ان کی وضاحت کی جاتی۔ اس طرح کچھ عرصہ ہم نے مجلس احرار اور اس کے قائدین و زعماء کے فضائل و مناقب کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف کیا اور اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کو اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی تلقین کی۔

اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ اب اس عمر میں کبھی یہ واقعہ ذہن میں آتا ہے تو خیال کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی تھی۔ جہاں ہم جاتے' لوگ بے حد متاثر ہوتے اور پورے غور سے بات سنتے۔ ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی کرتے اور جلسے میں شرکت کا وعدہ بھی کرتے۔ پندرہ بیس روز کے بعد دو چار روز کے لئے ہم مرکز الاسلام آتے اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ مولانا محمد علی لکھوی کو پیش کرتے تو وہ نہایت خوشی کا اظہار فرماتے اور ہماری حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ انتہائی زندہ دل اور بے حد خوش مزاج عالم دین تھے۔ ہر لڑکے سے الگ الگ اس کی کارکردگی کے بارے میں پوچھتے اور اپنے اندازِ خاص سے اس کی تعریف فرماتے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں ...

۷ اکتوبر ۱۹۳ء کو جلسے سے ایک دن پہلے مولانا محمد علی لکھوی کی قیادت میں احرار رضاکاروں کی طرح سرخ قمیص پہنے' ایک بڑے جلوس کی شکل میں ہم فیروزپور پہنچے اور نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے ہوئے' جلسے کے وسیع میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی لکھوی اسی لباس میں تھے جو وہ روزانہ پہنتے تھے۔ یعنی سفید کھدر کی قمیص' کھدر کا سفید عمامہ اور کھدر کا تہ بند۔ ہر ضلعے کے لئے الگ الگ کیمپ لگائے گئے تھے۔ ہمارا بھی ایک کیمپ تھا۔

احرار رضاکار سرخ قمیص کے ساتھ ایک صاف ستھری چمکتی دمکتی چھوٹی سی کلہاڑی ہاتھ میں رکھتے تھے مگر ہمارے پاس کلہاڑیاں نہیں تھیں۔ مجلس احرار کے بعض اکابر بھی سرخ قمیص پہنتے اور ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے تھے۔

پروگرام کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوتا تھا۔ اسی دن جلسے کے میدان میں نماز عصر کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ کسی نے آواز دی وہ دیکھو شاہ جی گھوم رہے ہیں۔ میں دوڑ کر آیا اور انتہائی شوق اور مسرت کے ساتھ شاہ جی کو دیکھا۔ پورا قد' گٹھا ہوا جسم' سرخ و سفید رنگ' موٹی موٹی چمکدار آنکھیں جو ان کی ذہانت کی غماز تھیں' سیاہ اور سفید بالوں پر مشتمل داڑھی جو نہایت خوب صورتی سے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کھدر کی سرخ رنگ کی قمیص' سر پر قدرے اونچی دیوار کی قراقلی ٹوپی' جس سے ان کے پٹے باہر جھانک رہے تھے' پاؤں میں پشاوری چپل۔ ہاتھ میں کلہاڑی' جس کا دستہ ان کی کمر کے برابر تھا اور خاکی رنگ کی ٹخنوں سے ذرا اونچی شلوار...... ! وہ چل پھر کر جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہے تھے مولانا محمد علی لکھوی بھی ادھر آ نکلے۔ وہ مصافحے کے لئے ان کی طرف بڑھے' وہ بھی تیزی سے ان کی جانب آئے اور دونوں بزرگ بغل گیر ہو گئے۔ پھر گرم جوشی سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے خیر خیریت پوچھی۔ اس موقعے پر مولانا مظہر علی اظہر' صاحبزادہ فیض الحسن' شیخ حسام الدین اور چند اور لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ بھی کمال احترام اور تپاک سے مولانا لکھوی ... ملے۔ اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد یہ حضرات بعض مقامی اصحاب کی رفاقت میں پنڈال میں داخل ہو گئے اور گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔

یہ اولیں موقع تھا کہ میں شاہ جی کے دیدار سے بہرہ اندوز ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک مردانہ حسن کے تمام اوصاف سے متصف تھے اور اپنے اندر انتہائی کشش رکھتے تھے۔ نظیری کا یہ شعر ان پر حرف بحرف صادق آتا تھا۔ ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آج یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کی شب کو جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، اس واقعہ پر آدھی صدی سے اوپر (یعنی اکیاون برس ڈیڑھ مہینے کا) طویل عرصہ بیت چکا ہے، مگر وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور لیل و نہار کی بے شمار کروٹوں کے باوجود حافظے نے ان کے اس وقت کے حلیے اور ہیئت کذائی کا کوئی گوشہ فراموش نہیں کیا۔ ہر چیز کو نہایت احتیاط سے محفوظ کر رکھا ہے۔ ؎

بہرِ تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ ناز اک جنبش ترے ابرو میں تھی

مجلس احرار کے فیروز پور کے اس جلسے میں ہزاروں افراد کا جمع تھا۔ شہر اور ضلع کے قصبات و دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ احرار مقرروں کی تقریریں سننے آئے تھے۔ شہر سے جانب مغرب، پانچ میل کے فاصلے پر، دریائے ستلج کا حسینی والا ہیڈ عبور کرتے ہی لاہور کا ضلع شروع ہو جاتا تھا جو اب ضلع قصور کہلاتا ہے، اس سے بہت سے لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے اور وسیع پنڈال میں ہر طرف انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

شاہ جی عشاء کی نماز سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد چند لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے، امیر شریعت زندہ باد، مجلس احرار زندہ باد اور نعرۂ تکبیر سے فضا گونجنے لگی۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے تمام اکابر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ سٹیج اتنا اونچا تھا کہ چار یا پانچ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے اوپر جانا پڑتا تھا۔ شاہ جی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر ایک کرسی پر، جو خاص طور سے ان کے لئے رکھی گئی تھی، تشریف فرما ہوئے۔ میرے خیال میں رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ تقریر کے لئے مائک پر آئے اور پھر نعرے بلند ہونے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے نعروں کا سلسلہ بند کرایا اور ایک اندازِ خاص سے دائیں بائیں دیکھ کر مائک کو ذرا اپنے قریب کیا اور خطبۂ مسنونہ کے الفاظ سامعین کے کانوں سے ٹکرانے لگے۔ نہایت دلکش اور رسیلی آواز۔ خطبے کے مضمون سے جب آواز کا زیر و بم ہم آہنگ ہوتا تھا تو لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ پھر جب درود شریف پڑھنا شروع کیا اور

جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں۔

اللّٰھم صل علیٰ محمّد و علیٰ آلِ محمّد کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوئے تو اس میں کچھ اور ہی لطف پنہاں تھا۔ اس وقت عقیدت و انکسار کے تمام لوازم ان کی ذات اور زبان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں.....

سبحان اللہ! ان اوصاف کا حامل شخص اب کہاں پیدا ہو گا۔

ان کی تقریر متعدد مسائل پر مشتمل تھی۔ مجھے اب کچھ یاد نہیں کہ انہوں نے تقریر میں کیا کہا، البتہ اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف خوب برسے، مرزائیت کی تردید کی، مسئلہ توحید کی وضاحت فرمائی اور قرآن کی بہت سی آیات تلاوت کیں اور ان کا ترجمہ سنایا۔ اس زمانے میں مجلس احرار نے حکومت الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا تھا، شاہ جی نے اسے بھی منقح کیا۔ کئی گھنٹے تقریر جاری رہی۔ ادھر مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا، ادھر مقرر نے خاموشی اختیار کر لی اور تقریر ختم ہو گئی۔

اس سے تقریباً تیرہ مہینے بعد ۱۹۳۸ء کے آخر میں دلّی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے دیکھا کہ شاہ جی ننگے سر تھے' نہ سر پر ٹوپی تھی' نہ کپڑا۔ ان کے سفید گھنگھریالے بال عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سنا ہے کہ شاہ جی نے اس وقت سے ٹوپی اتار دی تھی' جب انہیں پتہ چلا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا سید حسین احمد مدنی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔

یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا' جب مولانا مدنی صوبہ سرحد کے دورے سے بذریعہ ٹرین دیوبند جا رہے تھے۔ جب ٹرین جالندھر اسٹیشن پر پہنچی تو چند مسلم لیگی نوجوان اپنے ایک ساتھی شمس الحق کی معیت میں وہاں آئے۔ مولانا کو برا بھلا کہا' ان کی پگڑی اتار لی' طمانچہ مارا اور گالیاں دیں۔ شاہ جی اس کے بعد امرتسر کے ایک جلسے میں پہلی مرتبہ ننگے سر آئے اور فرمایا! جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اتاری ہے' میں نے عہد کیا ہے آئندہ سر پر ٹوپی نہیں رکھوں گا۔

آغا شورش کاشمیری نے اس حادثے کے متعلق اپنی کتاب "بوئے گل' نالۂ دل' دُودِ چراغِ محفل" (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء) کے صفحہ ۲۷۶ کے حاشیئے میں لکھا ہے۔ "ہمارے ایک دوست ڈاکٹر اکرام الحق قریشی جالندھر میں لیگ کے پرجوش کارکن تھے۔ حمید نظامی مرحوم کے کلاس فیلو رہے۔ ان کا بیان تھا کہ شمس الحق اپنے اس کارنامے کا کرتوفرلے کر مولانا عظامی کے ہاں پہنچا۔ وہ ان دنوں مقامی لیگ کے نائب صدر تھے۔ مولانا عظامی واقعہ سن کر کانپنے لگے۔ بار بار پوچھتے واقعی تم نے یہی کیا ہے؟ کہنے لگے میاں! جس نے حسین احمد کے ساتھ یہ کیا ہے' اس کی تو نعش بھی نہیں ملے گی۔ سب کو معلوم ہے کہ شمس الحق پاکستان آ کر قتل ہو گیا۔ اس کی نعش تک نہ ملی' بلکہ معمّا ہی رہا۔ اس کا دوسرا ساتھی مہاجرت کے وقت دریائے بیاس میں ڈوب گیا"۔

شاہ جی کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ جن حضرات کو دلی جانے اور اس شہر کو دیکھنے کا موقع ملا ہے' اور وہاں کی جامع مسجد بھی دیکھی ہے' میں ان کو یہاں جلسے کا محل وقوع بتانے کی کوشش کروں گا۔

دلی کی جامع مسجد (جسے شاہ جہانی مسجد بھی کہا جاتا ہے) کے بڑے دروازے کے سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ اسی میدان میں ہرے بھرے کا مزار ہے اور یہیں مولانا شوکت علی کا مدفن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر ہے۔ میدان کے اختتام پر لال قلعے کا دروازہ ہے اور یہ وہی قلعہ ہے جو مغل شہنشاہ شاہ جہان نے تعمیر کیا تھا۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ایک خاصی چوڑی سڑک ہے' جس پر بے شمار گاڑیاں چلتی ہیں جو لوگوں کو مختلف مقامات میں پہنچاتی ہیں۔ جامع مسجد کے جنوب میں اردو بازار ہے۔ میں دلّی میں شاہ جی کے جس جلسے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں' اس کا سٹیج اردو بازار کے قریب تھا اور بازار مقرر کی پشت کی جانب تھا۔ ان کی بائیں جانب جامع مسجد اور دائیں جانب لال قلعہ تھا۔ ان کے سامنے وسیع میدان میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ یہ جلسہ جمعیت علمائے ہند کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ شاہ جی کی تقریر عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی۔ تقریر میں سیاسیات بھی تھیں اور مذہبیات بھی! لوگ اس طرح خاموش اور ہمہ تن گوش تھے جیسے کان علیٰ رؤسھم الطیور کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں' جوں ہی سر ہلا اور پرندے اڑے...... شاہ جی کہہ رہے تھے۔ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے ملک کو ظالم کے پنجے سے چھڑانے کے لئے عمل و حرکت کے میدان میں اترنا مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ مطالبۂ آزادی کے مقابلے میں یہ پکڑ دھکڑ' یہ قید و بند' یہ سزائیں' یہ پھانسیاں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے آزادی سب چیزوں سے عزیز ہے۔ دلّی والو......! جس

اُدھر مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا

اِدھر مقرّر نے خاموشی اختیار کر لی اور تقریر ختم ہو گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورت میں بھی آزادی ملے اور جن مشکلات سے گزر کر ملے، اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے دونوں ہاتھ ملا کر اور ہتھیلیاں اس انداز سے حاضرین کی طرف بڑھا کر جیسے پانی سے گزرنے کا راستہ بنا رہے ہوں، پنجابی کا یہ شعر پڑھا۔

شاہ جی نے کہا کہ میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں 'واہ شاہ جی واہ۔' جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں 'آہ شاہ جی آہ۔' میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

جے ہیر سمندروں پار ہووے
مُکّاں نال سمندرنوں چھٹ سٹاں

تو مجمعے کے سکوت کا مضبوط بند ٹوٹ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ داد و تحسین کے انداز میں اچھلنے اور سر ہلانے لگے۔ جبہ و دستار میں ملبوس علمائے کرام بھی تڑپ اٹھے۔ واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور "امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد"! کے نعرے گونجنے لگے۔

ظاہر ہے دلی کے سامعین میں سے بہت ہی کم لوگوں نے پنجابی کے اس شعر کے معنی سمجھے ہوں گے، مگر شاہ جی نے جس اسلوب، جس ہیئت اور جس جذبے سے شعر پڑھا اور جس طرح دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر اسے عملی شکل میں ڈھالا، اس نے شعر کے ایک ایک لفظ کا مطلب بالکل واضح کر دیا تھا۔

سامعین کی زبانوں سے "واہ واہ" کا لفظ سن کر شاہ جی نے کہا کہ میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں 'واہ شاہ جی واہ۔' جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں 'آہ شاہ جی آہ۔' میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جو ستمبر ۱۹۴۵ء تک چھ سال جاری رہی۔ انگریزی حکومت کی مخالفت کی پاداش میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے زعماء و قائدین کو گرفتار کر کے حکومت نے ملک کے مختلف جیل خانوں اور قلعوں میں بند کر دیا تھا۔ چھ سال کی قید کے بعد انہیں رہا کیا گیا تو برطانیہ کی توپ و تفنگ کی جنگ جیتنے والی حکمران جماعت کنزرویٹو پارٹی اپنے ملک میں ووٹ کی جنگ ہار چکی اور لیبر پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی، جس کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی تھے۔ انہوں نے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کیلئے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سر سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس پر مشتمل تھا۔ اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا ہے۔

یہاں اس سلسلے کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، اختصار کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد حکومت ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور) میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا اور عمر کی بیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ کل رات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قصور تشریف لا رہے ہیں اور وہاں وہ جلسہ عام میں تقریر کریں گے۔ میں نے اور مولانا معین الدین لکھوی نے قصور جانے اور شاہ جی کی تقریر سننے کا پروگرام بنایا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔

ہم قصور پہنچے تو فیروز پور اور دیگر مقامات کے بہت سے لوگ مل گئے جو شاہ جی کی تقریر سننے آئے تھے۔ طویل عرصے کے بعد شاہ جی اس نواح میں تشریف لائے تھے۔ شب نو بجے کے بعد ان کی تقریر شروع ہوئی اور چار گھنٹے جاری رہی۔ شدید سردی کا موسم تھا اور ہم نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ وہ ملک میں انتخابات کے ہنگاموں کے دن تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے وہاں کے دیہاتی حلقے میں میاں افتخار الدین انتخاب لڑ رہے تھے جو کچھ عرصہ پہلے کانگرس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ شاہ جی نے تقریر میں انگریزی حکومت کی نہایت سخت لب و لہجے میں مخالفت کی اور عالم اسلام اور ہندوستان پر اس کے بے پناہ مظالم تفصیل سے بیان کئے، مسلم لیگ کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور اس کے سیاسی نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دور تک پھیلا ہوا انسانوں کا یہ ہجوم شاہ جی کی مٹھی میں ہے اور ان کی پُرجوش خطابت نے ان کو پوری طرح مسحور کر دیا ہے۔ انہوں نے بعض جماعتوں کے قائدین کی عملی حالت کو بھی موضوع بحث بنایا اور اسلام سے متعلق ان کے قول و فعل کے تضادات کا جائزہ لیا۔ پھر اسلامی تعلیمات کی خصوصیات کا ذکر فرمایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ جی جیسا بے خوف، مسلسل کئی کئی گھنٹے بولنے والا، اپنے نقطۂ فکر کے اظہار میں مخلص اور زوردار خطیب برصغیر نے پیدا نہیں کیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تو شاہ جی دلی گئے اور ایک رات جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ دوران تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو، کیبنٹ مشن کے ایک رکن سرسٹیفورڈ کرپس کو وہاں لے گئے۔ کرپس چند منٹ جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ وہ ان کی تقریر تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اسلوبِ بیان سے متاثر ہو کر اس نے جواہر لال سے کہا کہ جس ملک میں اس قسم کے سیاسی مقرر اور خطیب ہوں، وہ ملک آخر کب تک غلام رہ سکتا ہے۔ یہ شخص بہت بڑا مقرر ہے اور شکل و صورت سے "فادر" معلوم ہوتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان نقشۂ عالم پر ابھر آیا۔ ہم لوگ اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ، حال ضلع فرید کوٹ مشرقی پنجاب) کی سکونت ترک کر کے چک نمبر ۵۳ گ ب تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) آ گئے۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا، اسی سال کے آخر یا ۱۹۴۸ء میں لائل پور میں مجلس احرار کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے کا اہتمام مولانا تاج محمود، مولانا عبید اللہ احرار (جو فیروز پور سے لائل پور جا بسے تھے) اور ان کے دیگر احرار دوستوں نے کیا تھا۔ میرے گاؤں کے بہت سے لوگ جلسہ سننے گئے، میں بھی گیا۔ رات کو اس جلسے میں شاہ جی نے بھی تقریر کی اور شورش کاشمیری نے بھی۔ شورش نے اس زمانے میں ہفت روزہ "چٹان" جاری کر رکھا تھا اور وہ مجلسِ احرار سے الگ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور زعمائے احرار نے بھی تقریریں کیں، لیکن سب مقرروں کی تقریریں ڈھیلی تھیں اور لہجے مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ جذبہ، وہ جوش اور وہ تند و تیز اسلوب جو احرار مقرروں کا خاصہ تھا، مفقود تھا۔

کوئی زمانہ تھا کہ لاہور میں یا کسی اور جگہ اعلان ہوتا کہ شاہ جی رات کو دس بجے تقریر کریں گے تو لوگ پانچ بجے ہی رات کا کھانا پانی لے کر جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے اور فجر کی اذان تک بیٹھے ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے رہتے۔ مگر لائل پور کے اس جلسے میں ہم نے دیکھا کہ شاہ جی کی تقریر بھی سامعین کے دلوں میں گرمی نہ پیدا کر سکی۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے لئے ایک مجلس عمل (ایکشن کمیٹی) بنائی گئی تھی، جس کا صدر مولانا سید ابو الحسنات قادری اور ناظم اعلیٰ مولانا داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں مجلس عمل کے تمام ارکان (مولانا داؤد غزنوی کے سوا) گرفتار کر لئے گئے تھے اور لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔ اس کا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد اعظم خاں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ پہلا مارشل لاء تھا جس سے پاکستان کے لوگ آشنا ہوئے۔ اس کے بعد مارشل لاؤں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس اعتبار سے لاہور کے مارشل لاء کو آئندہ مارشل لاؤں کی ریہرسل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں ان دنوں اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور مولانا غزنوی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے۔ مجلسِ عمل کی چند میٹنگیں مرکزی جمعیت کے دفتر میں بھی ہوئیں، جن میں مجھے بھی شمولیت کا موقع ملا اور میں نے ان سب حضرات کو قریب سے دیکھا اور سنا۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گرفتاریوں تک نوبت پہنچے تو مولانا غزنوی گرفتاری سے بچنے کی کوشش کریں تاکہ تحریک کی رفتار بند نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں عمل و حرکت کا سلسلہ جاری رہے۔

جن بزرگوں کو حکومت نے ابتدا ہی میں گرفتار کر لیا تھا، ان میں شاہ جی بھی شامل تھے اور یہ سب حضرات سنٹرل جیل لاہور میں محبوس تھے۔ کئی سال ہوئے اس جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شاندار اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔ جسے شادمان کالونی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے مارچ کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا داؤد غزنوی نے ان حضرات سے جیل میں ملاقات کا پروگرام بنایا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ مزنگ چونگی سے گلبرگ کو جاتے ہوئے شادمان چوک پہنچیں تو بائیں جانب نکڑ پر ایک مسجد ہے جو پہلے چھوٹی سی مسجد تھی، اب کافی وسیع ہو چکی ہے۔ اس کے بالکل سامنے سڑک سے دوسری طرف سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی تھی، جس میں انگریزی عہد کی ہیبت کے تمام عناصر نمایاں تھے۔ قاعدے کے مطابق سنتری بندوق کندھوں پر رکھے ہر آن وہاں کھڑا رہتا تھا۔ مولانا غزنوی کی آخری سیاسی قید کے تین سال (۵۔ اگست ۱۹۴۲ء سے ستمبر ۱۹۴۵ء تک) اسی جیل میں گزرے تھے۔ مولانا نے اپنا ملاقاتی کارڈ جیل کے ایک ملازم کے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجا۔ وہ فوراً باہر آئے، مولانا کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ان کے ساتھ تھا۔ مولانا کے کہنے پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مولانا ابوالحسنات، شیخ حسام الدین اور شاہ جی کو وہیں بلا لیا اور گفتگو کے لئے الگ کمرہ دے دیا۔ مولانا غزنوی نے ان حضرات کو جیل سے باہر کی صورتحال سے آگاہ کیا اور جس رفتار سے تحریک چل رہی تھی اور گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اس کی تفصیل بتائی۔

اب شاہ جی بوڑھے ہو چکے تھے اور جسمانی کمزوری کے آثار ان کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کا دل جواں تھا۔ جذبات کی دنیا پوری طرح آباد تھی اور کلمۂ حق کہنے کا داعیہ جوبن پر تھا۔ انہوں نے مولانا سے فرمایا، آپ ہماری کوئی فکر نہ کریں، ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لئے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انہی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔ ہمیں یہاں کامل اطمینان اور سکون حاصل ہے۔ آپ ہمیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے اور تحریک جاری رکھئے۔ خود کوئی ایسا قدم نہ اٹھایئے، جس سے گرفتاری تک نوبت پہنچ جائے اگر ایسا ہوا تو تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے ملاقات رہی اور ہم واپس آ گئے۔

اور یہ سب حضرات سنٹرل جیل لاہور میں محبوس تھے۔ کئی سال ہوئے اس جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شاندار اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔

جب تک تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت میں گرفتار ہونے والے حضرات لاہور سنٹرل جیل میں محبوس رہے، مولانا غزنوی کئی مرتبہ ان سے ملاقات کیلئے گئے۔ میں ان کے ساتھ صرف دو مرتبہ گیا۔ بعد میں شاہ جی کو سکھر جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔

تحریک میں حصہ لینے والے لوگوں پر حکومت نے بے پناہ سختیاں کی تھیں، اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا تھا اور مجلسِ احرار خلافِ قانون قرار دے دی گئی تھی۔ پھر ایک تحقیقاتی عدالت قائم کر دی گئی تھی جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل تھی۔ عدالت لاہور ہائیکورٹ میں قائم کی گئی تھی اور تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات قلمبند کئے گئے تھے جنہیں جیل سے پولیس کی تحویل میں لایا جاتا تھا۔ تحریک کی طرف سے مولانا داؤد غزنوی وکیل تھے۔ کمرۂ عدالت لوگوں سے بھر جاتا تھا اور سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے اکثر وکلاء کارروائی سننے کیلئے آتے تھے۔ مرزائیوں کی طرف سے بھی وکیل مقرر تھے۔ شاہ جی کو بیان دینے کیلئے جس دن عدالت میں طلب کیا گیا تھا، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم وہاں جمع تھا اور تمام اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔

شاہ جی کو جب لایا گیا ان کے آگے پیچھے پولیس کے اہلکار تھے۔ وہ کمرۂ عدالت میں آئے تو شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر ننگا تھا (پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اتاری گئی ہے، انہوں نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی) شاہ جی نے اپنے بیان میں مرزائیت کے پس منظر کی وضاحت کی اور پھر تفصیل سے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے، وہ شریعتِ اسلامی کی رو سے دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جو لوگ اس کو نبی مانیں اور اس کے بارے میں ظلّی و بروزی کے چکر میں پڑیں، یا اس کی مدافعت کریں یا حامیانِ تحفظِ نبوت کو صرف اس وجہ سے مبتلائے اذیت کریں کہ وہ مرزا غلام احمد اور اس کے ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، میں صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک وہ مسلمان نہیں ہیں۔ شاہ جی نے نہایت جرأت مندانہ انداز میں کہا، جب تک میں زندہ ہوں یہ اعلان کرتا رہوں گا اور یہ اعلان کرنا اور اس پر قائم رہنا میری زندگی کا ایسا مشن ہے، جس سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔ جو شخص مجھے اس سے روکنے کی کوشش کرے گا، میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا اور میں اس کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں۔

شاہ جی کا بیان کافی دیر جاری رہا اور درمیان میں بعض لوگوں نے نعرے لگائے تو عدالت نے نعرے لگانے سے روک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا۔ خود شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے، تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے اگرچہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو...... بیان کے بعد عدالت نے حکم دیا کہ جب تک تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے رہنماؤں کے بیانات اور تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل ہی میں رکھا جائے۔ ممکن ہے کسی اور موقع پر عدالت کو ان کی ضرورت پڑے۔

۲۵، ۲۶ر فروری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں دلی دروازے کے باہر تحفظ ختم نبوت کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں بعد دوپہر شاہ جی نے تقریر کی۔ جیل سے رہائی کے بعد لاہور میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی، جو تین گھنٹے جاری رہی۔ بہت بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے عقیدہ ختم نبوت اور تحریک تحفظ ختم نبوت کی وضاحت کی لیکن اب ضعف و نقاہت نے ان کو گھیر لیا تھا۔ وہ مسلسل تیس برس تک لوگوں کے جذبات و احساسات کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھالتے رہے تھے، مگر اب ان میں وہ کس بل نہ رہے تھے۔ نہ اب برطانوی حکومت ان کی حریف تھی، جس کی ستم گری کے بوقلموں واقعات سے ان کو پُر تاثیر جملوں اور نوع بنوع فقروں کا ذخیرہ عطا ہوتا تھا۔ نہ کوئی اور سیاسی طاقت ان کے مدِ مقابل رہی تھی۔ جس پر تنقید کرتے ہوئے وہ نئے سے اسلوب کلام اور موثر ترین اندازِ بیان سے حاضرین کو تڑپاتے اور گرماتے تھے۔ اب ان کا لہجہ مرجھا چکا تھا اور جوشِ خطابت ماند پڑ گیا تھا۔

اس تقریر میں شاہ جی نے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں بھی بعض باتیں ارشاد فرمائیں۔ یہ کسی خاص تاثر کی بناء پر ایک بڑے آدمی کا ایک بڑے آدمی اور اپنے پرانے ساتھی کے بارے میں اظہارِ خیال تھا۔

جلسہ گاہ میں میں نے دیکھا کہ چند نوجوان چار پانچ کتابچے تقسیم کر رہے ہیں۔ ان میں ایک نوجوان میرے پاس بھی آیا اور کتابچے دے کر نکل گیا۔ میں نے دیکھے تو دو کتابچے میرے ہی دو اداریوں پر مشتمل تھے جو میں نے "الاعتصام" میں لکھے تھے۔ سولہ سولہ صفحات کے یہ کتابچے میرے نام سے چھپے تھے اور مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت ملتان نے شائع کیے تھے۔

اس کی مناسب تفصیل تو انشاء اللہ اس مضمون میں بیان کی جائے گی۔ جو میں کسی وقت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لکھنا چاہتا ہوں، لیکن یہاں مختصر الفاظ میں عرض کر دوں کہ ۱۵ر مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی مرحوم نے برکت علی ہال (لاہور) میں جمعیت حدیث کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے صحیح بخاری کے بارے میں ایسے الفاظ ارشاد فرمائے تھے جو اہل سنت کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے "الاعتصام" میں (جس کا میں اس زمانے میں ایڈیٹر تھا) اس کا نوٹس لیا تو جماعت اسلامی کے حلقوں میں شدید ردِ عمل ہوا اور اس کے تمام رسائل و جرائد میدان میں نکل آئے۔ طرفین میں ایک صحافتی "جنگ" شروع ہو گئی اور پھر یہ جنگ اسی ایک محاذ میں محدود نہ رہی بلکہ اپنی فطرت کے مطابق بہت سے محاذوں میں پھیل گئی اور متعدد حضرات نے اس میں حصہ لیا۔ ۱۷ر جون ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی نے سرگودھا میں تقریر کی تو اس میں بھی بعض عجیب و غریب باتیں ارشاد فرمائیں۔ میں نے اس سے "الاعتصام" کی دو اشاعتوں..... ۱۵ر جولائی اور ۲۲ر جولائی ۱۹۵۵ء..... میں اظہار اختلاف کیا۔ عنوان تھا "لاہور کے بعد سرگودھا۔ راہ اعتدال یا راہ اعتزال"۔ مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے ایک کتابچے کی صورت میں اسے "راہ اعتدال یا راہ اعتزال" کے نام سے شائع کیا۔

مولانا مودودی نے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے (ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء میں) بعض تعجب انگیز باتیں تحریر فرمائی تھیں۔ میں نے "الاعتصام" کے ۴ر نومبر اور ۱۱ر نومبر ۱۹۵۵ء کے اداریوں میں "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" کے عنوان سے اس کے بارے میں لکھا۔ اسے بھی کتابچے کی شکل میں مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیا۔ ان دونوں کی اشاعت کا علم مجھے اسی جلسے میں ہوا۔ جو ۲۵، ۲۶ر فروری ۱۹۵۶ء کو دلی دروازے کے باہر لاہور میں ہوا تھا اور جس کے آخری اجلاس میں شاہ جی نے تقریر کی تھی۔

۱۹۵۶ء کے مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں شاہ جی لاہور ہی میں تھے اور مجلس احرار کے دفتر (بیرون دلی دروازہ) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن دس بجے کے قریب مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی دفتر "الاعتصام" تشریف لائے اور مولانا داؤد غزنوی سے ملے۔ میں اس وقت مولانا کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں [illegible] سے متعلق کچھ لوگوں نے شاہ جی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مولانا غزنوی کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں، جن کا ذکر شاہ جی نے چند روز پیشتر اپنے خاص انداز میں ۲۶ر فروری کی تقریر میں کیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے رفیق کار سے اس کی امید نہیں رکھتے تھے، اس لئے انہیں شاہ جی سے دوستانہ شکوہ تھا۔ مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی چاہتے تھے کہ مولانا تھوڑی سی تکلیف فرمائیں اور شاہ جی کے پاس تشریف لے جائیں تاکہ باہمی گفتگو سے غلط فہمیاں دور ہو جائیں، مگر مولانا اس پر آمادہ نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ پہل شاہ جی کی طرف سے ہوئی ہے، از راہِ کرم وہ تشریف لائیں اور اپنا نقطۂ نظر واضح فرمائیں۔ میں بھی انہیں اپنا موقف بتاؤں گا۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو صاف لفظوں میں معافی مانگ لوں گا۔

کافی دیر گفتگو ہوتی رہی، بالآخر مولانا نے فرمایا کہ میں اپنے ایڈیٹر (یعنی اس راقم عاجز) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ ان سے میرے موقف کی وضاحت کریں گے اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ان دونوں صاحبان نے یہ تجویز منظور فرمائی اور میں مولانا کی نمائندگی کیلئے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس دن ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ مجلس احرار کا دفتر دلی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے کی بلڈنگ کی دوسری اور تیسری منزل میں تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر گارے کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اسی بلڈنگ میں احرار کے ترجمان روزنامہ "آزاد" کا دفتر تھا، جس کے ایڈیٹر ان دنوں مولانا مجاہد الحسینی تھے۔ ہم دوسری منزل میں گئے تو ایک بڑے کمرے میں موئے بان کی چھوٹی سی چارپائی پر برصغیر کا شہنشاہ خطابت آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ فرش پر ایک بڑی سی دری بچھی ہوئی تھی، جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے بڑے بڑے سوراخ خاموش زبان سے اس کی بوسیدگی اور کہنگی کا اعلان کر رہے اور بتا رہے تھے کہ یہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس پر بے شمار کاروانِ احرار گزر چکے ہیں۔

مولانا نے فرمایا، آپ ہماری کوئی فکر نہ کریں، ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لئے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انہی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔

دری پر سات آٹھ آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے اور شاہ جی نظر کی عینک لگائے اور ہڈیوں کا ڈھانچا بنے مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور نگاہیں کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم تینوں ان کے انہماک کو دیکھ کر "سرہانے میر کے آہستہ بولو" کی عملی تصویر بنے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھے اور جوتے اتار کر اور بزبانِ خفی السلام علیکم کہہ کر نہایت ادب سے دوزانو ہو کر دری پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شاہ جی نے کاغذ سے نگاہ اٹھائی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مودبانہ اور نیازمندانہ سلام عرض کیا اور گردن جھکا کر دونوں ہاتھ ان کے بابرکت ہاتھوں میں دے دیئے۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کھڑے ہو کر میرا تعارف کرایا۔

ان پاک طینت لوگوں کو ہمیشہ کے لئے دھرتی نگل گئی ہے اور اس کینڈے کے لوگ اب کبھی سطح ارض پر نمودار نہیں ہوں گے۔ افسوس ہے۔ ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میرا نام (جو صحیح معنوں میں گم نام ہے) سنتے ہی بیسویں صدی کے برصغیر کا خطیبِ اعظم چارپائی سے اٹھا اور مجھے اپنی

شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے، تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بغل میں لے لیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی سے کہا، تم خاموشی سے آکر بیٹھ گئے، آتے ہی کیوں نہیں بتایا، میں اپنے عزیز کو لینے کے لئے دروازے پر جاتا۔ اپنے برابر مجھے چارپائی پر بٹھایا۔ عجیب تربات یہ کہ اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا اور جو بڑا سا تکیہ چارپائی پر پڑا تھا، ٹیک لگانے کے لئے عنایت فرمایا۔ میں اس پیکرِ شفقت کی یہ پُرخلوص باتیں سن کر اور کیفیت انکسار دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ تو سرہانے کی طرف کسی نہ کسی طرح بیٹھا، پھر یہ عرض کر کے پائنتی میں آگیا کہ اب تعمیلِ ارشاد ہو گئی اور الامرُ فوق الادب پر عمل کر لیا گیا ہے۔

شاہ جی نے لطف و کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں آپ کے اخبار "الاعتصام" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں، آپ کے اداریے پڑھتا ہوں اور خوش ہو کر آپ کو دعا دیتا ہوں۔ آپ کے دو اداریے تو میں نے مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت ملتان کی طرف سے کتابی صورت میں شائع بھی کرائے ہیں، جن میں سے ایک کا عنوان "راہِ اعتدال یا راہِ اعتزال" اور ایک کا "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" ہے۔ پھر یہ دو کتابچے مجھے عطا فرمائے۔

اس کے بعد انہیں مولانا داؤد غزنوی کا سلام پہنچایا گیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کہا کہ مولانا سے بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ وہ کسی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکے، میرے متعلق بتایا کہ یہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے آپ سے بات کریں گے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مجھے شاہ جی کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا شرف حاصل رہا...... تمام گفتگو میں انہوں نے یا تو مجھے اسحاق صاحب کہہ کر خطاب فرمایا یا میرے عزیز کہہ کر......! جمال و انکسار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا میں فقیر آدمی ہوں۔ مولانا داؤد غزنوی سے خفا ہونے اور ان سے گلے شکوے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں امرتسر کی ایک مسجد میں بیٹھا زندگی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے تھوڑے سے علم کے مطابق وعظ و نصیحت کی خدمات انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ داؤد غزنوی مجھے جانتے تھے اور میرے طریقِ وعظ کا انہیں علم تھا۔ میں نہایت سادگی سے رہتا اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند باندھتا تھا۔ ان کا گھرانہ فضل و کمال اور تصوف و طریقت کا گھرانہ تھا، جس کے فیوض کا دائرہ سارے پنجاب پر محیط تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی تو نہایت مہربانی کا اظہار کرتے، میں بھی جھک کر سلام کرتا۔ ان کی بھی جوانی کا زمانہ تھا، میں بھی جوان تھا۔ لیکن ان کا شمار اس دور کی مجلس خلافت کے قائدین میں ہوتا تھا اور میں گوشہ نشین امام مسجد تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کیوں مسجد میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ اٹھو میدانِ عمل میں نکلو، ملک و قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں ان کے کہنے سے مسجد کی چار دیواری سے باہر نکل آیا اور تحریکِ خلافت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میانوالی جیل میں ہم دونوں اکٹھے رہے اور بارہا جیل اور ریل میں ہماری رفاقت رہی۔ تحریکِ خلافت میں، جمعیت علمائے ہند میں (جس کے بانیوں میں خود داؤد غزنوی کا نام بھی شامل ہے) مجلس احرار میں اور بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں ہم نے ایک ساتھ کام کیا، ایک سٹیج پر تقریریں کیں اور بے شمار مواقع پر ہم سفر رہے۔

شاہ جی نے فرمایا میں سیاست میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور استاد کا گلہ کرنا اس فقیر کا شیوہ نہیں۔ میری جوانی گزر گئی، کہولت کا زمانہ بیت گیا، اب بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میں ہرگز اس سیدزادے سے خفا نہیں یہ میرا اللہ اللہ کرنے کا وقت ہے، گلے شکوے کی کتاب کھول کر بیٹھنے کا نہیں۔ اسحاق صاحب! میرا انہیں نیازمندانہ سلام پہنچایئے اور میری طرف سے عرض کیجئے کہ وہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں، مجھ گنہگار کے لئے دعا کریں۔ میں بھی ان کے لئے دعاگو ہوں۔ میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا۔ آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس فقیر کے پاس آنے کی زحمت گوارا کی۔

شاہ جی نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ ان کا لہجہ انتہائی نرم اور طرزِ کلام بدرجہ نہایت میٹھا اور پیارا تھا۔ اثنائے گفتگو میں کئی دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے اور زبان کے طرزِ ادا نے ان کی اندرونی کیفیت کا پتا دیا۔ زندگی میں میری ان سے یہ پہلی اور آخری گفتگو تھی جو بہت سی گفتگوؤں پر بھاری تھی۔ اس میں شاہ جی نے اپنے دل کا صاف و شفاف آئینہ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ گفتگو تاثر پذیری کے بے شمار نقوش میری لوحِ قلب پر مرتسم کر گئی۔

میں نے واپس آکر مولانا کو تفصیل سے یہ باتیں سنائیں اور شاہ جی نے ان کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا تھا، اس کی وضاحت کی۔ ظاہر ہے خود مولانا بھی اپنے متعلق شاہ جی [illegible] معلوم کرنے کے لئے [illegible] تھے اور میرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں پورے غور اور توجہ سے سنیں اور دورانِ سماعت میں کئی مرتبہ اشکبار ہوئے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ بات چیت سے شاہ جی کی افسردگی کا اندازہ ہوتا تھا اور سننے والے بھی افسردہ تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ ع

افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

شاہ جی کی جسمانی حالت اور نرمیٔ کلام کو دیکھ کر داغ کا یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ہوش و حواس و تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

شاہ جی برصغیر کے بے مثال خطیب اور عظیم مجاہد تھے۔ قرآن مجید پڑھتے تو معلوم ہوتا کہ قرأت و تجوید کے تمام لوازم کے ساتھ لحن داؤدی سے سرفراز کر دیئے گئے ہیں۔ اردو بولتے تو شبہ پڑتا کہ غالب، ذوق اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت اختیار کر لی ہے۔ پنجابی میں بات کرتے تو محسوس ہوتا کہ راوی اور چناب نے اپنی روانیاں انہیں بخش دی ہیں۔

وہ غلامی کے دور میں پیدا ہوئے اور غلامی کے شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس خطۂ ارض نے بڑے بڑے لوگوں کو جنم دیا، جن میں شہرۂ آفاق سیاست دان بھی تھے اور اونچے درجے کے مقرر و خطیب بھی۔ منجھے ہوئے اصحاب درس و تدریس بھی تھے اور عالی مرتبے کے مصنفین و مؤلفین بھی۔ پاکیزہ وش صوفیاء و اتقیاء بھی تھے اور اہل تحقیق مناظر و ناقد بھی۔ یہ حضرات ایک خاص فضا اور ماحول کی پیداوار تھے۔ اب ان اوصاف کے حامل لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ سانچے مدت ہوئی ٹوٹ گئے، جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالمِ وجود میں آئے تھے۔

شاہ جی اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ان لوگوں میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ صفِ اوّل میں جگہ پاتے تھے۔ ان کی تقریر میں شیر کی گرج، خطابت میں دریا کی روانی اور تنقید میں تلوار کی کاٹ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش میں پھولوں کی مہک اور گلاب کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔

وہ انتہائی نرم گفتار بھی تھے اور بدرجۂ غایت تیز کلام بھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف لب کشائی کرتے تو زبان آگ اگلنے لگتی اور توحید و سنت کے موضوع پر وعظ کہتے تو لہجہ بدل جاتا اور نرمی و ملائمت کا پیکر بن جاتے۔ وہ سحر طراز خطیب اور شیوہ بیان مقرر تھے۔ جو بات کرتے اخلاص میں ڈوب کر کرتے اور وہ بات سامعین کے دلوں کی گہرائیوں میں اترتی اور اپنی جگہ بناتی چلی جاتی۔ جس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے متعلقات کی اس اسلوب میں وضاحت کرتے کہ حاضرین پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ چھ چھ سات سات گھنٹے بے تکان بولتے اور دریا کی سی روانی سے بولتے۔ جب تک تقریر کا سلسلہ جاری رہتا ایسے محسوس ہوتا کہ فضا پر نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔ وعظ و تقریر میں ایسے ایسے لطائف و ظرائف اور حکایات بیان کرتے کہ محفل کشت زعفران بن جاتی۔ مجمع پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتا، وہ ہنساتے بھی تھے اور رُلاتے بھی۔ فارسی، اردو اور پنجابی کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ موقع و محل کی مناسبت سے اس انداز میں شعر پڑھتے کہ معلوم ہوتا، شاعر نے اسی مقام کے لئے شعر کہا ہے۔

انہوں نے جگر داری کے ساتھ انگریز سے ٹکر لی، بہادری اور حوصلے کے ساتھ قید و بند کی سختیوں کو جھیلا اور جرأت و بے باکی سے حریف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی عزیمت ان کی عظمت کا پتا دیتی ہے، ان کا ایثار ان کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کی درویشی ان کی رفعت کو اجاگر کرتی ہے۔

اگر وہ اپنی خداداد قابلیتوں کی بنا پر پیری مریدی کی راہ اپناتے تو لاکھوں ہاتھ بیعت کے لئے آگے بڑھتے اور انسانوں کے گروہ کے گروہ قدم بوسی کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اگر دنیوی مال و منال کی طرف عنانِ توجہ مبذول کرتے تو اپنی جاذب قلب و نظر شخصیت کی بنا پر عوامی محبوبیت کا مرکز قرار پاتے اور سیم و زر کے اونچے اونچے ڈھیر ان کے سامنے ہوتے۔

وہ اس وقت انگریز کے قلعۂ اقتدار میں شگاف ڈالنے کے لئے میدان میں اترے، جب اس کے خلاف منہ سے کوئی لفظ نکالنا اپنے آپ کو بے پناہ مصائب کے سپرد کر دینے کے مترادف تھا اور انہوں نے اس دور میں سلطان جائر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمۂ حق بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی تھا۔ انہوں نے تحریکِ ہجرت میں حصہ لیا، تحریکِ خلافت میں قربانیاں دیں اور ہر اس محاذ پر دادِ شجاعت دی، جس سے انگریز کے پندارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔ بلاشبہ ان کی سیاسی خدمات کا سلسلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت طویل اور انتہائی دردناک ابواب پر محیط ہے۔

مجلس احرار کے قیام کے بعد، جس کے بانیوں میں خود شاہ جی تھے، وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مجلسِ احرار سے وابستہ رہے۔ اس میں یا تو درمیانے درجے کے لوگ شامل تھے یا غریب و نادار ...! میرے خیال میں اس جماعت میں صرف ایک چودھری، ایک نواب زادہ اور ایک صاحب زادہ تھے۔

جبکہ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں نوابوں اور نواب زادوں اور صاحب زادوں اور چودھریوں اور سیٹھوں اور خان بہادروں اور سرکاری خطاب یافتوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔

احرار کے نواب زادہ اور صاحب زادہ (نواب زادہ نصراللہ خاں اور صاحب زادہ فیض الحسن) کو میں نے مجلسِ احرار کے مرکزی دفتر لاہور میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں اس وقت دیکھا تھا، جب صوبہ بہار میں فسادات کا زور تھا اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا اور غریب مجلس احرار کے قائم کردہ بہار فنڈ میں غریب لوگ چندہ جمع کراتے تھے۔ میں بھی اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ، حال ضلع فرید کوٹ، مشرقی پنجاب) کے غریب مسلمانوں کی طرف سے تین سو ساٹھ روپے کی غریبانہ رقم جمع کرانے کے لئے مجلس احرار کے دفتر لاہور آیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس رقم کی رسید ثناءاللہ بھٹہ نے دی تھی اور انہی کے اس پر دستخط تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مجلسِ احرار کے چودھری (افضل حق) جو بے چارے برائے نام چودھری تھے، ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے اور آزادی کے فوراً بعد نواب زادہ اور صاحب زادہ دونوں اس جماعت سے الگ ہو گئے۔ اور یہ جماعت بدستور قلندروں اور ملنگوں کی جماعت رہی۔ لیکن مجلس احرار کے یہ قلندر اور ملنگ اور درمیانے درجے کے لوگ ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے، آزادیٔ وطن کے لئے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو احرار، انگریز کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور گرفتار کر لئے گئے۔ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو جب کانگرس نے بمبئی میں "ہندوستان خالی کرو" ریزولیوشن پاس کیا تو اس کے سرکردہ لیڈروں اور بہت سے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن مجلس احرار کے قائدین و ارکان اس وقت جنگ کے بعد دوسری مرتبہ گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس صورت حال کے متعلق سبھاش چندر بوس نے کانگرس پر طنز و طعن کے انداز میں ایک بیان میں کہا تھا کہ مجلس احرار کے ارکان کانگرسی نیتاؤں سے قربانی میں کہیں آگے ہیں جو آزادیٔ وطن کے لئے تین سال کے عرصے میں حکومت برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کر کے دوسری مرتبہ جیلوں میں جا رہے ہیں۔

مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو شاید جیل جانے کا "مرض" لاحق ہو گیا تھا۔ جیل سے باہر کھلی فضا میں رہنا ان کو راس نہیں آتا تھا۔ دو ڈھائی مہینے باہر رہتے تو انہیں کھجلی سی ہونے لگتی اور اس کا علاج ان کے نزدیک جیل جانا ہی تھا۔

اس موقع پر مجھے آزادی سے پہلے کی دیوان سنگھ مفتون کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ ان کے اخبار "ریاست" کا ایک کالم "سوال و جواب" تھا۔ کسی نے ان سے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور ان کے عمائد و ارکان کی خصوصیات کے بارے میں سوال کیا، جن میں مجلسِ احرار بھی شامل تھی۔ انہوں نے تمام جماعتوں کے بارے میں جواب دیا اور ان کا دلچسپ تجزیہ کیا، مجلس احرار کے ارکان کے بارے میں ان کا جواب تھا کہ مجلس احرار ملک کی وہ سیاسی جماعت ہے، دھؤاں دھار تقریریں کرنا جس کے لیڈروں کا پیشہ ہے۔ وہ انگریز حکومت کے بھی خلاف ہیں، ہندوؤں کے بھی مخالف ہیں، کانگرس سے بھی ان کا تصادم ہے اور مسلم لیگ سے بھی چپقلش ہے۔ یہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، جلسوں میں جائیں تو نہایت معمولی ہوٹل یا تنور سے دال روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جیل سے باہر رہنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کئے رکھتے ہیں، جس کے باعث جیل جانا ضروری ہو جائے۔

برصغیر کو انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لئے شاہ جی نے جو جدوجہد کی وہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کا طویل پس منظر ہوتا ہے، جس میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور ہر دور میں متعدد جماعتیں اپنے اپنے انداز سے حصولِ آزادی کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ پھر ان سب کی مخلصانہ کوششوں سے آزادی کی نعمت میسر آتی ہے۔ شمعِ حریت کبھی کسی ایک ہی سمت سے صحنِ ملک میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف اوقات و حالات میں مختلف سمتوں اور مختلف دروازوں اور ذریعوں سے آتی اور چمن زارِ وطن کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر بہت ہی "حساس" عناصر ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند لفظی تجزیئے کو اپنی سیاسی عصبیت کی بھینٹ نہ چڑھا دیں تو ہم عرض کریں گے کہ آزادئ وطن اور قیام پاکستان میں مجلس احرار اور شاہ جی کی تگ و تازِ مجاہدانہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہی جماعتوں کے ارباب قیادت کی سعئ مسلسل سے ہم نے انگریز کی غلامی سے چھٹکارہ پایا اور انہی کی قربانیوں کی بدولت ہم حریت و آزادی کے دور میں داخل ہوئے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کیوں مسجد میں بیٹھے اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ اٹھو میدان عمل میں نکلو، ملک و قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔

شاہ جی اور چھوٹے بڑے تمام قائدین احرار میں یہ خوبی تھی کہ ہر آن اور ہر حال میں خوش و خرم رہتے تھے۔ لطیفے بازی اور ہنسی مذاق ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ اس پر ان کی مخالف سیاسی جماعتوں کے بعض لوگ طعنہ زن بھی ہوئے، مگر احراریوں نے اس کی پروا نہیں کی۔

یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ احرار ہمیشہ برصغیر کی انگریزی حکومت کے معتوب رہے اور بعض مخالف سیاسی جماعتوں نے بھی انہیں ذہنی پریشانی میں مبتلا کئے رکھا۔ پھر ان کے مادی وسائل بھی بہت محدود تھے اور بعض تو مفلسی کی حالت میں تھے۔ اگر ان میں لطیفے بازی کی حس نہ ہوتی اور یہ لوگ ہنسی مذاق سے آشنا نہ ہوتے، ہر وقت ماتھے پر تیوریاں چڑھائے اور اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کئے رکھتے تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ انہوں نے ہمیشہ ہنسی مذاق اور لطائف و ظرائف میں غم غلط کرنے کی کوشش کی اور ان حالات میں ان کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے احساس کو کسی نہ کسی حد تک دور کرنے کے لئے اس قسم کا اسلوب اختیار کرنے کو میرے خیال میں نامناسب نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اسے دورِ مارشل لاء کی قانونی بولی میں "نظریۂ ضرورت" سے تعبیر کرنا چاہئے یا ہماری عام زبان میں "امرِ مجبوری" کہہ لیجئے۔

شاہ جی نہایت حاضر جواب بھی تھے۔ ایک دفعہ دوران تقریر میں کسی نے ان سے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا درجہ بلند ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا.....؟ انہوں نے فوراً جواب دیا۔ حضرت علیؓ میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طالب ہیں اور حضرت عمرؓ آپ کے مطلوب.....! اور مجھے میرے نانا کے طالب و مطلوب دونوں سے محبت ہے اور ان کی محبت میرا جزوِ ایمان ہے۔

شاہ جی کا سلسلۂ نسب چھتیس واسطوں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۱۰ ہجری (۱۸۹۱ء) کو ہندوستان کے صوبہ بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ جب فہم و شعور نے انگڑائی لی اور عقل و خرد نے کچھ منزلیں طے کیں تو امرتسر آ گئے۔ سیاسی زندگی کا آغاز مولانا داؤد غزنوی کے کہنے سے ۱۹۱۹ء میں کیا جبکہ تحریک خلافت شباب پر تھی۔ بارہا جیلوں میں گئے اور طویل قیدیں کاٹیں۔

عمل و حرکت کے اعتبار سے انہوں نے بھرپور زندگی بسر

مجلس احرار کے یہ درمیانے درجے کے لوگ ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے، آزادئ وطن کیلئے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کیلئے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

© rasailojaraid.com